# مکاتیب

(۱)

محترم جناب عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم پر الشریعہ کا خصوصی شمارہ اور اپنی تالیف ''توہین رسالت کا مسئلہ- چند اہم سوالات کا جائزہ'' ارسال فرمانے کا شکریہ۔ ثانی الذکر کے بالاستیعاب اور اول الذکر کے چنیدہ مقامات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ان دنوں توہین رسالت کے مسئلہ کے زیر بحث آنے کے تناظر میں راقم کی رائے ہے کہ توہین رسالت پر سزائے موت ہی ہونی چاہیے اور سزائے موت کا قانون نہ صرف باقی رہنا چاہیے، بلکہ اس قانون پر کسی بھی دوسرے قانون پر عمل درآمد کے سلسلہ میں متصور مستعدی سے کہیں زیادہ مستعدی سے عمل کیا جانا چاہیے۔ وطن عزیز کے معروضی حالات اور اہل وطن کے احساسات کو پیش نگاہ رکھیں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ لبرل اور سیکولر حضرات کا ''فائدہ'' اس قانون کے خلاف واویلا میں نہیں بلکہ اس پر موثر اور بلا تاخیر عمل درآمد نہ ہونے پر واویلا کرنے میں ہے۔ معلوم نہیں یہ سیدھی سی بات ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ یہ قانون اور اس پر موثر عمل درآمد توہین رسالت کے ملزموں کا ماورائے عدالت قتل روکنے کا سب سے بہتر طریق کار ہے۔ اس سلسلہ میں ذرا سی کمزوری بھی، جیسا کہ گورنر سلیمان تاثیر کے قتل سے واضح ہے، ''تمھی قاتل، تمھی مخبر، تمھی منصف ٹھہرے'' ہی کا نتیجہ پیدا کرے گی۔ بلاشبہ قانون توہین رسالت اور ملزم توہین رسالت کے اقدام قتل کے بیک وقت دفاع میں کھلا تضاد ہے اور کسی بھی عقلی ومنطقی دلیل سے اسے درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (قانون کا تو مطلب ہی یہی ہے کہ ملزم انصاف کے کٹہرے میں آئے، اس کا ٹرائل ہو اور پھر اس کے معاملے کا فیصلہ ہو۔ اگر متاثر افراد نے خود سے ہی معاملات فیصل کرنا ہوں تو ظاہر ہے کہ قانون کی سرے سے ضرورت ہی نہیں) لیکن کیا کیجیے کہ یہ بھی قانون کے نفاذ میں کمزوری ہی کا کیا دھرا ہے۔ (وہ لوگ سخت برخود غلط اور معروضی حالات کے ادراک سے یکسر قاصر ہیں جو قانون توہین رسالت پر عمل درآمد کو بھی دیگر قوانین پر عمل درآمد کا سا معاملہ خیال کرتے ہیں۔) یہاں چشم بینا کو کوئی حل اس کے سوا دکھائی نہیں دیتا کہ ادھر کسی شخص پر توہین رسالت کا الزام لگے اور ادھر وہ عدالت کے حصار میں ہو اور پھر انتہائی نیک نیتی سے اس کا ٹرائل یوں ہو کہ ہر آنکھ کو انصاف ہوتا ہوا نظر آئے۔ اگر یہ نہیں تو کہانیاں ہی ہیں اور کہانیاں ہی رہیں گی۔

اور یہ سوال شاید کرنے کا نہیں کہ قانون کی کمزوری یا سست روی کا ردعمل زیر نظر معاملے ہی میں اس سرعت سے ''تمھی قاتل، تمھی مخبر، تمھی منصف ٹھہرے'' کی شکل میں سامنے آتا کیوں دکھائی دیتا ہے؟ اس لیے کہ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہاں کوئی Metaphysical involvement ہے اور اس لیے کہ خداوندِ قدوس نے اگر ہر چیز بالحق پیدا فرمائی ہے اور دینی تناظر میں جنون و وارفتگی کا بھی کوئی مصرف ہے، تو وہ ذات مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا اور آپ کی عزت وناموس ہے۔ یہاں اس کے سوا کچھ سوجھتا نہیں کہ:

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

جہاں تک آپ کی تالیف کے حوالے سے کسی خالص مبسوط علمی تنقید وتبصرہ کا تعلق ہے تو اس کی سردست فرصت ہے نہ بساط۔ اس عاجز نے مذکورہ مسئلہ پر مختلف اہل فکر کے زاویہ نظر کے مالہ وماعلیہ کے مطالعہ کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ آپ کی تالیف کچھ مزید اہم پہلو سامنے لائی ہے۔ یہ بے شبہ نہایت مدلل اور معلومات افزا ہے۔ میں نے کچھ چیزیں ترتیب دینے کی کوشش کی تھی، لیکن ہنوز کوئی قابل اشاعت چیز تیار نہیں کر سکا۔ شاید کبھی ہو جائے۔ سردست صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دلِ ناداں اس مسئلہ کو Rationalize کرنے پر مطمئن نہیں ہوا۔ کوئی کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ:

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ڈاکٹر محمد شہباز منج
شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف سرگودھا
drshahbazuos@hotmail.com

(۲)

برادرم عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم! الشریعہ مارچ کا شمارہ مطالعہ سے گزرا۔ اس شمارہ میں مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان اور پروفیسر محمد مشتاق احمد صاحب کے مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ توہین رسالت کے مسئلہ پر دونوں مضامین بے حد معتدل اور متوازن محسوس ہوئے۔ خاص طور پر پروفیسر مشتاق احمد صاحب کا مضمون اپنے عنوان کی وجہ سے محسوس ہوتا تھا کہ ایک رواجی ذہن کا مضمون ہوگا۔ لیکن اس مضمون کے مندرجات نہ صرف سلیس زبان لیے ہوئے ہیں بلکہ فکری توازن سے بھی آراستہ ہیں۔ ایک علمی اور تحقیقی مضمون کے لیے جس متوازن اور سنجیدہ زبان و بیان کا حامل ہونا ضروری ہے اس سے یہ مضمون بخوبی آراستہ محسوس ہوا۔ توہین رسالت کے مسئلہ پر معروف ایڈووکیٹ جناب اسماعیل قریشی صاحب کی ضخیم کتاب کے مطالعہ کے باوجود ایک پیاس اور کسک باقی رہ جاتی ہے۔ محترم پروفیسر مشتاق احمد صاحب کے مضمون سے مجھے اپنی یہ پیاس بجھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرے خیال میں یہ مضمون اسلام کی رحمت اور عدل پر مبنی معتدل، متوازن اور معقول دعوت اور تعلیمات کی زیادہ صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ تاہم محترم پروفیسر صاحب کے مضمون کے اقتباس ''اسی

اصول پر طے کیا گیا ہے کہ اگر ملک کا سب سے برتر حکمران حد کے جرم کا ارتکاب کرے تو اسے حد کی سزا نہیں دی جا سکے گی'' میں جس بے بسی اور اسلامی قانون کی خامی کا اظہار ہوتا ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ اسلامی ضابطہ حیات ہی کی روشنی میں مختصر الفاظ میں اس کا حل بھی بتا دیا جاتا۔ جناب انعام الرحمٰن کا مضمون حسب روایت غیر علمی انداز کا حامل ہی محسوس ہوا۔ موصوف اگر ''نیم طنز و نیم استہزا'' کی غیر علمی عادت سے گریز کرتے تو شاید موصوف کا یہ مضمون کسی درجے میں علمی کہلانے کا حقدار کہلاتا اور قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کر سکتا۔ لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شاید موصوف علم اور تحقیق کے جذبے سے نہیں لکھتے بلکہ اپنی ''طنز اور استہزا'' کی عادت کی تسکین کے لیے لکھتے ہیں۔ ہمارا عاجزانہ مشورہ ہے کہ جتنی جلد ہو سکے، وہ اپنی اس عادت سے جان چھڑا لیں، ورنہ شاید یہ عادت ان کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو گھن کی طرح چاٹ جائے۔

''قومی وملی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت'' کے عنوان کے تحت آپ کے والد محترم مولانا زاہد الراشدی صاحب نے جن خیالات کا اظہار فرمایا، اس میں بعض نکات کو ہضم کرنا خاصا مشکل محسوس ہوا۔ ان کے ارشادات کا معروضی خلاصہ یہ ہے کہ اہل تشیع کی تکفیر بالاجماع ہو چکی، لہٰذا اہل تشیع کو کافر سمجھنے کے باوجود ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفاد اور کاز کے حصول کے لیے کی جانے والی جدوجہد میں مسلمانوں کے ساتھ ان کی شرکت کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ تاہم جب ہم مسلم فقہا و اہل علم کے فتاویٰ کی طرف دیکھتے ہیں تو اہل تشیع کو ''کافر'' ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں، اور جب جمہور کے عملی طرز عمل کو دیکھتے ہیں تو پھر اہل تشیع کو مسلمانوں کا حصہ ماننا پڑتا ہے۔ یہ صورتحال ایک عام آدمی کو اچھی خاصی کنفیوژن اور الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ اس الجھن میں اس وقت زبردست اضافہ ہو جاتا ہے جب مولانا زاہد الراشدی دامت برکاتہم اپنے موقف کی حمایت کے لیے دور نبوی سے استشہاد و استدلال فرماتے ہیں۔

اس استدلال کا معروضی تجزیہ کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین سرداروں اور ان کے پیروکاروں کو کافر ڈکلیئر کر دیا تھا اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں ان کی شمولیت و اشتراک بطور ''کافر ملت'' قبول کی تھی؟ سیرت و تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ پھر یہیں سے ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی اجتماعی کاز یا جدوجہد میں اہل تشیع کے اشتراک اور شمولیت سے پہلے کیا جمہور المسلمین یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ پیش آمدہ ''دینی و مذہبی جدوجہد'' میں اہل تشیع کی شمولیت بطور ایک معاون ''کافر ملت'' یا ''غیر مسلم'' اقلیت کے طور پر قبول کی جا رہی ہے۔ اس سوال کا جواب بھی حالات و واقعات اور تاریخ سے یقیناً نفی ہی میں ملتا ہے۔ سیرت رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور جمہور امت کے اس تعامل کو دیکھا جائے تو اہل تشیع کی تکفیر پر مبنی مفتیان عظام اور اہل علم کے فتاویٰ پر بھی سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اہل تشیع میں چند خاص لوگوں کے کھلم کھلا اظہار کفر اور باطل عقائد کی دعوت کی پاداش میں عام لوگوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کی سزا کیوں دی جائے؟ بزرگوار محترم جناب راشدی صاحب کے موقف سے جہاں الجھن اور تناؤ میں اضافہ ہوا، وہاں ان کے اقتباسات پر غور کرنے سے مسئلہ کا حل بھی مل گیا۔

میری عاجزانہ اور عامیانہ بساط اس الجھن کا یہ حل تجویز کرتی ہے کہ جناب زاہد الراشدی صاحب کے اقتباسات کی روشنی میں ہم اس معروضی نتیجہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں کہ اہل تشیع کی اکثریت کا معاملہ دور رسالت کے منافقین

سے ملتا جلتا ہے۔ جیسا کہ گروہ منافقین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کافر ملت'' ڈکلیئر نہیں کیا تھا، بالکل اسی طرح اہل تشیع کو بھی ''ملت کافر'' ڈکلیئر کرنا خلاف سنت وحکمت ہے۔ چونکہ منافقین کی اکثریت ''وماھم بمومنین'' کے قرآنی خطاب کے باوجود قانونی سطح پر قرآن انہیں ''ملت کافر'' قرار نہیں دیتا۔ بلکہ مسلم امت کا حصہ مانتے ہوئے انہیں خطاب کرتا ہے، قرآن ظاہری و باطنی اور فکری ونظری وعملی خرابیوں پر منافقین کی گرفت کرتا ہے۔ انہیں اصلاح وتوبہ کی دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا اس قرآنی دعوت کے نتیجہ میں دور رسالت میں جن لوگوں نے اپنی اصلاح کر لی اور نظری وعملی نفاق سے توبہ کر لی تو قرآن اس پر انہیں قانونی سطح پر ''کافر'' سے ''مسلم'' ہونا قرار نہیں دیتا بلکہ اس داخلی فساد کی اصلاح کو توبہ اور تزکیہ کا نام دیتا ہے۔ پھر منافقین چونکہ اپنے فکری فساد کو چھپایا کرتے تھے اور کافرانہ نظریات سے محبت رکھنے اور خفیہ طور پر ان کا اظہار کرنے کے باوجود عام مسلمانوں کے سامنے ان سے مکر جاتے تھے اور اصل اسلام کا اظہار کرتے تھے، اسی وجہ سے انہیں ''ملت کافر'' declare نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ظاہری اظہار اسلام کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں امت مسلمہ کا حصہ سمجھا گیا۔ اگرچہ ان کی اصلاح وتزکیہ کے لیے قرآن حکیم نے اپنی درجنوں بلکہ سینکڑوں آیات میں زور دیا ہے۔ بالکل اسی طرح اکیسویں صدی میں جو بھی گروہ کافرانہ نظریات وعقائد کا گرویدہ ہو اور خفیہ طور پر ان کا اظہار بھی کرتا ہو، مگر عام مسلمانوں میں اسلام کے متفقہ علیہ عقائد ونظریات کی پیروی کا دعویٰ کرے تو ان کے اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں ملت اسلامیہ کا حصہ مانا جائے گا اور اصل زور سیرت وقرآن کی پیروی میں ایسے لوگوں کی باطنی اصلاح وتزکیہ پر صرف کیا جائے گا۔

رہ گیا سوال مفتیان عظام اور اہل علم کے ان فتاویٰ کا جن میں اہل تشیع کی تکفیر کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی تعبیریوں کی جانی چاہیے کہ ان فتاویٰ کا اطلاق کسی خاص فرقہ اور معروف گروہ یا جماعت پر کرنے کی بجائے ملت اسلامیہ کے ہر فرقہ اور گروہ کے ان افراد پر ہوگا (چاہے وہ اپنے آپ کو اہل سنت ہی کیوں نہ کہلواتے ہوں) جو ان فتاویٰ میں بیان کیے گئے کفریہ عقائد ونظریات کے کھلم کھلا مدعی اور دعویدار ہوں۔ اور جو لوگ عام مسلمانوں کے سامنے ان باطل نظریات وعقائد کو غلط مانیں انہیں ان فتاویٰ کی گرفت سے آزاد سمجھا جائے، چاہے وہ اہل تشیع کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی اور فرقہ سے۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب کے استدلال واستشہاد سے ہمیں اپنی اس سوچ کو پختہ کرنے کا موقع ملا ہے کہ باطل نظریات وعقائد کے ایسے پیروکار جو خود کو مسلمان کہلواتے ہوں اور عام مسلمانوں سے کفریہ عقائد کو چھپاتے ہوں اور عام مسلم عقائد کے مدعی ہوں، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وختم نبوت کو تسلیم کرتے ہوں تو ایسی صورت میں چاہے ایسا کوئی ایک شخص ہو یا کوئی گروہ یا فرقہ اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی بلکہ ان کی اصلاح اور تزکیہ پر پورا زور اور کوشش صرف کی جائے گی۔ ہاں باطل نظریات اور کفریہ عقائد کا بطلان اور نکیر ببانگ دہل کی جائے گی اور اس میں کسی ملامت کرنے والی کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں کی جائے گی۔

اس بحث میں جہاں تک اہل تشیع کی بالاجماع تکفیر کے مسئلہ کا تعلق ہے تو بزرگوارم زاہد الراشدی دامت برکاتہم نے جو معروضی حقائق بیان فرمائے ہیں اس سے تو واضح ہوتا ہے کہ اہل تشیع کی تکفیر پر امت کا اجماع نہیں ہے۔ بلکہ اہل